جناب مظہر الدین صدیقی

عقیدۂ توحید کا عملی اطلاق

ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے عقیدۂ توحید پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن موجودہ زندگی پر اس کا عملی اطلاق کرنا نہیں جانتے ہیں۔ حالانکہ ہمارا اصلی مسئلہ یہی ہے کہ ہم اسلام کے توحیدی عقیدہ کو موجودہ حالات زندگی پر کس طرح منطبق کر سکتے ہیں۔ دوسرے مذاہب کے بالمقابل اسلام کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اُس نے زندگی کے تمام پہلوؤں اور متضاد حقیقتوں کو ایک واحد اصولِ فکر میں جمع کیا۔ دیگر اقوام و ملل نے زندگی کی وحدت کو الگ الگ شعبوں میں منقسم کر رکھا تھا جن میں سے ہر شعبہ اپنی جگہ مستقل اور قائم بالذّات بن گیا تھا۔ اسلام نے اس تفریق کو مٹا کر مختلف عناصر حیات کو یکجا کیا اور ہر عنصر کو اس کا جائز اور صحیح مقام عطا کیا۔ اس امتزاج و ترکیب کے باعث اسلامی میں ایک ایسی جامعیت پیدا ہو گئی جس سے تمام ملتیں ناآشنا تھیں۔ کیوں کہ اُنہوں نے صداقت کے کسی ایک پہلو کو لے کر اس میں مبالغہ آمیز شدّت برتی تھی جس سے دوسرے تمام پہلوؤں کی نفی ہو گئی تھی۔ اسلام ہی نے آکر تمام جزوی صداقتوں کو ایک کلی وحدت میں سمویا جس میں کسی جزوی صداقت کو کل کی حیثیت نہیں دی گئی تھی۔ مگر ہر ایک کو اُس کے صحیح مقام پر رکھا گیا تھا۔ اسی امتزاج و ترکیب جمع و تالیف اور اجتماع اضداد کا نام توحید ہے۔

انسانی فطرت ہمیشہ سے کثرت پرستی کی خوگر رہی ہے۔ یہ چیز صرف زمانہ قدیم کے لئے مخصوص نہ تھی۔ اسلام کے بعد مغربی تہذیب کے عروج کا دَور شروع ہُوا۔ تو اُس نے بھی وہی بنیادی گمراہیاں پیدا کیں۔ جو قدیم اقوام و مذاہب میں پائی جاتی تھیں۔ یعنی مختلف اجزائے صداقت کو مغرب کی جدید اقوام نے یکے بعد دیگرے کلی حقیقت تسلیم کر لیا۔ جس سے دوسری تمام صداقتوں کی نفی لازم آتی تھی۔ اس طرح موجودہ تہذیب بھی اِسی غلو اور مبالغہ آمیزی کا شکار ہو گئی جس سے قدیم تہذیبیں برباد ہوئی تھیں۔ اس نے سب سے پہلے انفرادیت اور آزادی کو اپنا دین و ایمان قرار دیا۔ اور زندگی کو تمام ضابطوں اور قوانین سے آزاد کر کے ہر شعبہ میں بے آئینی اور بے قیدی کا خیر مقدم کیا۔ سیاسی، جمہوریت اور شخصی آزادی کے ایک غلط تصور کے تحت اس نے معاشی زندگی کے دائرہ میں عدم مداخلت کے اصول پر بڑی شدّت سے عمل کیا۔ جس کے نتیجہ میں کمزور اور نادار افراد پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا۔ اور ملک کے تمام معاشی وسائل ایک محدود طبقہ کے ہاتھ میں آ گئے۔ پھر جب یہ فلسفہ حیات کچھ کام نہ آیا۔ تو اُس نے حکومت کی قاہرانہ طاقت کے آگے عجز و نیاز کا سر جھکانا شروع کیا۔ قانون کے جبر اور حکومتی ضوابط کی سختیوں کا ایسا مبالغہ آمیز استعمال کیا کہ شخصی آزادیاں بالکل فنا ہو گئیں۔ اور فکر و عمل کی حریت کا نام و

نشان مٹ گیا۔ اس طرح جمہوریت کی بے آئینی کے بعد کلیت پسندی اور آمریت کا دَور شروع ہُوا جس میں مملکت کا احترام پرستش کی حد تک پہنچ گیا۔

دوسرے شعبوں میں بھی مغرب کے میلاناتِ فکر کا یہی حال رہا۔ کبھی اس نے عقل کی بادشاہت کا اعلان کر کے وحی والہام کی حقیقت سے انکار کیا۔ اور زندگی کے تمام مسائل کو خالص مادّی اصولوں کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی۔ اس نئے طرزِ فکر کی رُو سے ہر صداقت اضافی قرار پایا لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ ان اضافی صداقتوں کا مرجع اور مضاف الیہ کیا ہے۔ آیا وہ بھی اضافی ہے یا مطلق۔ اسی طرح عقلیت کی نئی تحریک نے ابدی حقائق سے انکار کیا۔ اور زندگی کے تغیرات کا ایک مبالغہ آمیز تصوّر پیش کیا۔ پھر عقلیت کے دَور کے بعد ایک زمانہ وہ آیا، جب شوپنہار، نطشے، برگسان اور ولیم جیمس وغیرہ نے ارادہ کو کائنات کی عظیم ترین حقیقت تسلیم کیا اور عقلی قوتوں کا استخفاف کیا۔ اس نئے رجحانِ فکر کے مطابق وجدان کو عقل پا اور جبلتوں کو ذہن پر فوق قرار دیا گیا۔ اسی زمانہ میں ایک اور فلسفہ وجود میں آیا جس نے تاریخ کے تمام واقعات کی معاشی توجیہ کی اور زندگی کے ایک پہلو کا جو واقعتاً بڑی اہمیت کا حامل تھا اتنے مبالغہ کے ساتھ اثبات کیا کہ اس کے دیگر تمام پہلوؤں کی نفی ہوگئی۔ کارل مارکس کا معاشی فلسفہ انسانی زندگی کے تمام مسائل کو صرف روٹی اور پیٹ کے مسئلہ پر کہنا چاہتا ہے۔ اور اجتماعی زندگی کے دیگر تمام محرکات کو معاشی محرک کی ضمنی پیداوار قرار دیتا ہے۔ اسی فلسفہ نے انسان کو اس کے اخلاقی وجود کے مرتبہ سے گرا کر معاشی حیوان بنا دیا ہے۔

ایک اور مکتبِ خیال نے انسان کی جنسی خواہشات کی اہمیت کو محسوس کیا۔ اور اس میں اتنا غلو برتا کہ اس کی تمام ادبی، فنی، معاشرتی اور مذہبی سرگرمیوں کو اس ایک محرک کا نتیجہ ثابت کیا۔ اس فلسفہ کی رو سے حسن وجمال اور موزونیت وتناسب کے جتنے مظاہر دنیا میں موجود ہیں خواہ وہ زندگی کے کسی شعبہ میں پائے جائیں۔ صنفی خواہشات ومیلانات کی پیداوار ہیں۔ فکر وخیال کی رعنائیاں، معاشرت وتمدن کی زینتیں اور آرائشیں، مذاہب کی عبادات، تصوف کی لطافتیں، فنِ تعمیر کی صنعتیں سب کی سب جنسی رغبتوں کے مظاہر واشکال ہیں۔ غرضیکہ ہر شعبہ حیات میں مغربی تمدن نے کسی نہ کسی جزو کو کل قرار دیا۔ اور جن مختلف عناصر کی ترکیب وامتزاج سے زندگی وحدت پذیر ہوئی ہے اُن میں سے ایک کا اثبات اور باقی کی نفی کی۔

اسی طرح مغربی تمدّن نے افراد کی زندگی سے بھی جامعیت اور توازن کی صفات سلب کر لیں۔ ہر فن اور شعبۂ حیات میں تقسیم کار کے اصول پر اتنا زور کہ کسی شخص کو اپنے شعبہ یا فن کے سوا دیگر فنون اور شعبہ ہائے حیات سے کوئی مَس نہیں رہ گیا ہے۔ خصوصی ماہرین کے اس دَور میں یک رُخے انسانوں کی کثرت ہے۔ جو مسائلِ حیات کو صرف اپنے مخصوص شعبہ جاتی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ماہرینِ معاشیات اخلاقی امور کی اہمیت اور پیچیدگیوں سے نابلد، سیاست داں مذہب اور اس کے انقلاب انگیز اثرات سے غافل، مذہبی طبقات سیاست ومعیشت کے اصولوں سے ناواقف اور دوسرے ماہرینِ فن اپنے مخصوص علم کے سوا زندگی کے تقاضوں سے ناآشنا ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس دَور کے انسان کے لئے زندگی کا بحیثیت کل ادراک کرنا ناممکن ہوگیا ہے۔ اب عقیدۂ توحید کے عملی اطلاق کے یہ معنی ہوں گے کہ کسی جزو کو کل نہ بنایا جائے۔ اور زندگی کے مختلف عناصر اور

انسانی اعمال کے متعدد محرکات میں سے ہر ایک کو مناسب اہمیت دی جائے۔

عقیدۂ توحید کی رُو سے انسان کی معاشی ضروریات بھی اہم ہیں۔ کیونکہ وہ ابھی حیوانیت کے مرتبہ سے پوری طرح بلند نہیں ہوا ہے۔ اس کی جنسی خواہشات و میلانات بھی بے حقیقت نہیں ہیں۔ اس کے جمالیاتی ذوق و احساس کا بھی ایک خاص مقام ہے۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر اس کے اخلاقی تقاضوں اور روحانی اُمنگوں کی اہمیت ہے۔ کیونکہ وہ حیوانیت کی منزل سے نکل کر انسانیت کے مقام برتر تک پہنچنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کی انسانیت کا معراج یہی ہے کہ وہ اپنی مادی ضروریات جسمانی حوائج اور تمدنی تقاضوں کے مابین عدل و توازن اور ہم آہنگی پیدا کرے۔ اور ان میں سے کسی ایک کا غلام نہ بن جائے۔ اس لئے اُس کے اخلاقی مقاصد اور روحانی تمنائیں حیات مادّی سے الگ ہو کر پوری نہیں ہو سکتی ہیں۔ بلکہ اس کا جسمانی اور معاشرتی وجود بھی اس نصب العین کی تکمیل کا ذریعہ ہوگا۔ جس طرح انفرادی شخصیت کے ارتقاء اور کمال کے معنی یہ ہیں۔ کہ آدمی اپنے مختلف اور متصادم جذبات و میلانات پر اس طرح قابو حاصل کرے کہ کوئی میلان اور جذبہ اپنے جائز حدود سے آگے بڑھ سکے۔ لیکن کوئی جذبہ اور خواہش مطلقاً نفی بھی نہ ہو۔ اسی طرح تمدنی ارتقاء کے معنی یہ ہیں کہ اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں سے کسی ایک شعبہ اور اجتماعی محرکات میں سے کسی ایک محرک کو اتنی زیادہ اہمیت نہ دی جائے۔ کہ دیگر شعبہ جات اور محرکات کی کوئی قدر و قیمت نہ باقی رہے بلکہ ان تمام اضداد کو ایک ہم آہنگ اور یک رنگ وحدت ہیں میں جمع کر دیا جائے۔ پھر جس طرح شخصی زندگی میں یہ صورت اسی وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب نفس کسی اعلیٰ اصول کا تابع ہو کر اپنے متضاد مطالبات کے بالمقابل وہ حیثیت اختیار کرلے۔ جو فصل خصومات میں ایک جج کی ہوتی ہے بالکل اسی طرح اجتماعی زندگی میں یہ کیفیت تب رونما ہوتی ہے۔ جب زندگی کے مختلف پہلوؤں اور تمدن کے متضاد تقاضوں کے مابین صحیح فیصلہ کرنے کے لئے سوسائٹی کوئی ایسا اصول پیدا کرے۔ جس سے ان تقاضوں میں ہم آہنگی قائم کی جائے۔ اخلاق و روحانیت اور دین و مذہب کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کہ وہ ہمارے اندر فکر و نظر کا ایسا توازن پیدا کر دیتا ہے کہ ہم زندگی کے مطالبات اور اعمال کے متفرق محرکات کو باہم متصادم ہونے سے محفوظ رکھتے ہیں اور ہر ایک کو اس کا جائز حق دے کر معاشرہ میں صلح عدل اور مساوات قائم کر دیتے ہیں۔

ایک فکری اُصول کی حیثیت سے عقیدہ توحید کا عملی اقتضاء یہ ہے کہ ہم دنیا کے حالات و واقعات تمدن کے مختلف ادوار ملک کے نافذ الوقت قوانین اور معاشرت و تعلیم کے مروجہ طریقوں کو اختیار یا ترک کرنے میں ان کے مجموعی نتائج کو پیش نظر رکھیں۔ یعنی ان کے اثرات کا ہر پہلو سے مطالعہ کرنے کے بعد ان کی بابت کوئی رائے قائم کریں۔ کسی واقعہ، ادارہ قانون یا رسم و رواج پر صرف اس حیثیت سے غور کرنا کہ وہ معاشی نقطہ نظر سے فائدہ مند ہے یا مضر موجودہ تہذیب کا ایک خاصہ ہو گیا ہے۔ اسلام کا عقیدۂ توحید اس طرز فکر کا مخالف ہے۔ اسلامی اندازِ فکر کی رُو سے جو چیز وقتی طور پر یا معاشی حیثیت سے سود مند ہو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنے مجموعی نتائج کے لحاظ سے بھی قابلِ اختیار ہو۔ بلکہ اکثر اوقات عارضی مصالح اور وقتی فوائد کی بنا پر جس قانونی ادارے یا رسم و رواج کو اختیار کرنے کی صلاح دی جاتی ہے، وہ وسیع تر نتائج کے لحاظ سے مہلک یا مضر ثابت ہوتا ہے۔ اسلام میں زندگی کا

ایک کلی تصور اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے اسی لئے وہ اشیاء کی قدر و قیمت کا معیار بھی ان کے مجموعی نتائج کو قرار دیتا ہے۔ شراب کے متعلق قرآن کریم کا یہ ارشاد کہ اس میں فوائد بھی ہیں۔ لیکن نقصانات زیادہ ہیں، اسی طرزِ فکر کا آئینہ دار ہے۔ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ کسی شے کے ترک یا اختیار کرنے کا فیصلہ کرنے میں اس کے اخلاقی نتائج و اثرات کو سب سے زیادہ وزن دینا چاہیئے۔ یعنی اسے اس حیثیت سے دیکھنا چاہیئے کہ اس کے اختیار کرنے سے انسانی کردار پر کیا اثر پڑے گا۔ کسی عادت، رواج یا قانون کے صرف جسمانی معاشی یا سیاسی نتائج کو ملحوظ رکھنا اور انسان کے اخلاقی محرکات عمل پر اس کے جو ممکن اثرات ہو سکتے ہیں انہیں نظر انداز کر دینا اسلامی عقیدہ توحید کے منافی ہے۔ بلاشبہ ہمیں معاشرتی اداروں، ملکی قوانین اور معاشرتی رسم و رواج کے معاشی سیاسی نتائج پر بھی نظر رکھنی چاہیئے۔ لیکن اگر ان کے اخلاقی نتائج کو نظر انداز کر دیا جائے۔ یعنی ان کے اثرات کا اس نقطہ نظر سے اندازہ نہ کیا جائے کہ انسانی اخلاق و کردار اور انسان کے نفسیاتی محرکات پر ان کا کیا اثر ہوگا۔ تو یہ طرزِ فکر عقیدہ توحید کے لحاظ سے غلط اور مہلک ہے کیونکہ معاشی نقصانات کی تلافی ہو سکتی ہے۔ سیاسی خرابیوں کو درست کیا جا سکتا ہے۔ تمدنی امراض کا علاج ممکن ہے۔ لیکن سیرت کے بگاڑ اور اخلاقی محرکات کی کجی کو ٹھیک کرنا بہت دشوار اور محنت طلب ہے۔

اگرچہ قوانین اداروں، رسوم و رواج کے مختلف اثرات و نتائج میں سے ہر اثر کو اور ہر نتیجہ کو یکساں اہمیت حاصل ہے اور ہم واقعات و حالات یا سماجی اداروں کے معاشی اور سیاسی اثرات کو نظر انداز نہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے۔ کہ انسان کے عملی کردار پر ان کا جو ردِ عمل ہوتا ہے۔ اسلام کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت اسی کو حاصل ہے۔ اگر کسی عادت طریقہ یا قانون کے باعث معاشرہ میں تعیش، آرام پسندی، راحت طلبی یا خود غرضی پیدا ہوتی ہے۔ تو خواہ اس کے معاشی اور معاشرتی نتائج فوری طور پر سود مند ہوں یا تمدنی زندگی میں اس سے آسانیاں پیدا ہوتی ہوں۔ لیکن ان تمام فوائد کے مقابلہ میں اس کے نقصانات کا پلہ بھاری رہے گا۔ کیونکہ تعیش، آرام پسندی اور خود غرضی ایسے امراض ہیں جن سے نئے نئے امراض پیدا ہوتے ہیں جس قوم میں جفاکشی اور سخت کوشی کے صفات ناپید ہو جائیں جس جماعت میں ضبطِ نفس باقی نہ ہو۔ جو معاشرتی اور مذہبی پابندیوں سے اس لئے متنفر ہو جائے کہ ان سے آرام اور راحت یا خواہشاتِ نفس کی آزادانہ تکمیل میں خلل واقع ہوتا وہ قوم اگر دولت اور سرمایہ، صنعت و حرفت اور مشینی طاقتوں سے مسلح ہو تب بھی اپنی اخلاقی کمزوریوں اور ضبطِ نفس کے فقدان کے باعث زوال اور بربادی سے محفوظ نہیں رہ سکتی ہے۔ اس لئے عقیدۂ توحید کا اقتضا یہ ہے کہ جس عادت، رسم و رواج یا قانون سے انضباطِ نفس میں کمی واقع ہو یا خواہشات کی غلامی میں اور اضافہ ہو، وہ بہرحال قابلِ ترک ہے۔ خواہ معاشی اور مادی حیثیت سے اس میں بڑا فائدہ ہو۔ مسلمانوں کی موجودہ اجتماعی زندگی پر عقیدۂ توحید کا عملی اطلاق کرنے میں ہمیں اسلام کے اس بنیادی نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ یعنی جو امور ہماری اخلاقی سیرت پر اثر انداز ہوتے ہیں انہیں دیگر امور کی بہ نسبت زیادہ اہمیت حاصل ہونی چاہیئے۔

ہمارا ملک اس وقت جس دور سے گذر رہا ہے اس میں صنعتی توسیع زرعی ترقی اور تعلیم کی اشاعت کے تقاضے خاص

طور پر نمایاں ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان میں اوّلیت کس کو حاصل ہونی چاہئے۔ اور کس تقاضے کو کس پر ترجیح دینے کی ضرورت ہے۔ عقیدہ توحید کا اقتضا یہ ہے کہ ہم زندگی کے ان پہلوؤں کو مناسب اہمیت دیں اور کسی کی نفی نہ کریں۔ لیکن اسی توحیدی عقیدہ کا اقتضا یہ بھی ہے کہ ہم صنعتی توسیع اور زرعی ترقی کے بالمقابل تعلیم کی توسیع و اشاعت پر زیادہ توجہ دیں۔ کیونکہ انسان کی اخلاقی تربیت اور اس کی تشکیل سیرت میں تعلیم کو جتنا دخل ہے اتنا اور کسی چیز کو نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام نے زندگی کے اخلاقی اور مادّی تقاضوں کو یکساں اہمیت دی ہے لیکن اس کی نظر میں اخلاقی فوائد مادّی منافع کی بہ نسبت لائق ترجیح ہیں۔ قومیں مادّی وسائل کی کمی اور صنعتی یا زرعی پیداوار کی قلت کے باوجود بھی زندہ رہ سکتی ہیں لیکن جہالت، کم علمی اور اخلاقی افلاس میں مبتلا ہونے کے بعد کوئی قوم اپنا امتیازی وجود قائم نہیں رکھ سکتی ہے خواہ جسمانی حیثیت سے وہ حصول بقاء کی جدوجہد میں کامیاب رہے۔ دنیا کے تمام توحیدی مذاہب نے بالعموم اور اسلام نے بالخصوص تعلیم کی اشاعت کو اپنی کامیابی کی بنیاد قرار دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم نے جتنا رواج حاصل کیا اس کی مثال دوسری اقوام میں کم ملتی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں ہندوستان کے مسلمانوں میں خواندگی کا تناسب انگلستان سے زیادہ تھا۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں پر علمی اور اخلاقی انحطاط طاری ہو چکا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے دَورِ عروج میں تعلیم کا کیا حال ہوگا۔ اس لحاظ سے ہمیں تعلیم کو نہ کہ صنعتی توسیع یا زرعی ترقی کو اپنی جدوجہد کا محور قرار دینا چاہئے۔ ہمارے قومی میزانیہ کا بہت بڑا حصہ تعلیمی ضروریات پر صرف ہونا چاہئے۔ اور اس کے مقابلہ میں دیگر تمام ضروریات کو ثانوی درجہ دینا چاہئے۔ صنعتی اور زرعی ترقی کے اعتبار سے اگر ہم پیچھے رہ گئے تو اس سے ہماری قوم کو اتنا شدید نقصان نہیں ہوگا جتنا تعلیمی پس ماندگی سے ہوگا۔ علاوہ ازیں خالص مادّی نقطۂ نظر سے بھی تعلیم کی اہمیت کچھ کم نہیں ہے۔ آج کل کے زمانہ میں کوئی قوم صنعت و حرفت کے میدان میں آگے نہیں بڑھ سکتی ہے جو تعلیمی حیثیت سے پسماندہ ہو جب تک تعلیم کا دائرہ محدود اور معیار پست رہے گا محض کارخانوں کے قیام یا زرعی اصلاحات سے ہمارا ملک قومی ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتا ہے۔ غرضیکہ تعلیم کے مسئلہ کو جس پہلو سے بھی دیکھا جائے اس اہمیت ناقابلِ انکار ہے۔ ایسی صورت میں تعلیم سے اس وقت تک جو غفلت برتی گئی ہے وہ بڑی افسوس ناک ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر یہ حالت کچھ عرصہ تک اور قائم رہی تو ہماری قوم کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ ہمارے عقیدہ توحید کا لازمی تقاضہ ہے کہ ہم قوم میں تعلیم کی اشاعت کے کام پر سب سے زیادہ توجہ کریں۔ اور اس کے مقابلہ میں دیگر ضروریات کو ثانوی درجہ دیں۔

اسی طرح معاشی زندگی میں بھی ہمیں عقیدۂ توحید کی رو سے دو متضاد تقاضوں کے مابین مصالحت کرانی ہے معاشیات کا ایک نظریہ ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ اس دائرہ میں افراد کو پوری پوری آزادی ملنی چاہئے۔ اور معاشی امور میں حکومت کو کم سے کم مداخلت کرنی چاہئے۔ یہ نظریہ سرمایہ اور ملکیت کی کامل آزادی کا استقرار کرنا چاہتا ہے۔ اور ان تمام قیود کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے جن سے ملکیت یا سرمایہ کی تحدید عمل میں آتی ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ حکومت کو صنعتی اداروں اور کارخانوں کی ملکیت سے کوئی سروکار نہ رکھنا چاہئے اور نہ اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ مزدوروں کے حقوق کی حمایت کے لئے صنعتی امور میں مداخلت کرے۔ اسی طرح

زرعی امور میں بھی اُسے زمینداروں اور کاشتکاروں کو آزاد چھوڑ دینا چاہئے۔ اور زمینداری کی تحدید یا تنسیخ کے خیال سے دست بردار ہو جانا چاہئے۔ کیونکہ معاشی دائرہ میں آزاد مسابقت کا اصول ہی سب سے زیادہ سود مند اور کارگر ثابت ہو چکا ہے۔ اس لئے حکومت کے جس عمل سے مقابلہ اور مسابقت کی آزادی میں فرق آئے وہ معاشی زندگی کے لئے نقصان رساں ہے۔ اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا معاشی نظریہ ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ ملکیت کا انفرادی اور شخصی تصوّر سرمایہ داروں کا پیدا کیا ہُوا ہے۔ معاشرہ میں اس وقت جتنے مظالم اور ناانصافیاں ہو رہی ہیں۔ اُن کی تہ میں شخصی ملکیت کا اصول کارفرما ہے۔ لہٰذا معاشرتی عدل کے قیام کے لئے ذاتی ملکیت کے حق کو منسوخ کر دینا ضروری ہے۔ ملک کی تمام اراضیات حکومت کی مِلک ہونی چاہئیں۔ صنعت و حرفت اور تجارت پر بھی اس کا مکمل قبضہ ہونا چاہئے۔ بڑے بڑے کارخانوں اور کلیدی صنعتوں پر انفرادی ملکیت ختم ہو جانی چاہئے۔ کیونکہ ذرائع پیداوار سے استفادہ حاصل کرنے کا حق صرف حکومت کو پہنچتا ہے۔ لہٰذا شخصی ملکیت کی کامل تنسیخ کے بعد جملہ معاشی وسائل حکومت کو اپنے قبضہ میں لے لینے چاہئیں۔ اس نظام معیشت کے تحت وہ تمام اشخاص جو اس وقت صنعت و حرفت، تجارت اور زراعت کے کاموں میں مصروف ہیں۔ حکومت کے تنخواہ دار ملازمین کی حیثیت اختیار کر لیں گے اور ان میں سے ہر شخص کو اس کی ضروریات اور قابلیت کے لحاظ سے اُجرت دی جائے گی۔

ہمارا عقیدہ توحید ہمیں اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ ہم ان دونوں متضاد فلسفوں کے مابین مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کریں۔ اور معاشی زندگی میں افراط و تفریط کی خرابیوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ صنعت و حرفت اور زراعت کے شعبوں میں معاشی آزادی ہونی چاہئے لیکن یہ معاشی آزادی غیر مشروط اور بے قید نہیں ہو سکتی ہے۔ ہم ذاتی ملکیت کے حق کو مانتے ہیں مگر یہ نہیں مانتے ہیں کہ ملکیت کی تحدید ناجائز یا غیر ضروری ہے۔ جس میں افراد کی ایک کثیر تعداد اپنی اقل ترین ضروریات اور زندگی کی تمام آسائشوں سے محروم رہے۔ ہمارے نزدیک سرمایہ کی آزادی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مزدوروں سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے اور انہیں اتنی اجرت بھی نہ دی جائے کہ وہ اپنی ضروریات کی تکمیل نہ کر سکیں۔ اسی طرح بڑی بڑی زمینداریوں اور جاگیرداریوں کے جواز کی ہم کوئی وجہ نہیں پاتے ہیں۔ کیونکہ ان کی وجہ سے کاشتکاروں کی ایک بڑی تعداد ملکیت زمین سے محروم ہو گئی ہے۔ اسلام نے اعتدال و توسط کی جو تعلیم دی ہے اس کی رُو سے ہم یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ سرمایہ اور زمین کی ملکیت پر مناسب قیود عائد کئے جائیں۔ اراضی کا ایک زیادہ سے زیادہ رقبہ از روئے قانون متعین کیا جا سکتا ہے جس کے اندر شخصی ملکیت جائز متصور کی جائے گی۔ اور جس سے زیادہ رقبہ اراضی کسی ایک فرد کی ملکیت میں نہ آ سکے گا۔ ایسا قانون منشائے اسلام کے بالکل مطابق ہو گا۔ اسی طرح سرمایہ کی بھی ایک آخری حد مقرر کی جا سکتی ہے۔ تاکہ اس سے زیادہ سرمایہ پر ذاتی ملکیت کا دعوےٰ نہ کیا جا سکے۔ اسی کے ساتھ معاشرہ کے جملہ افراد کو یہ بنیادی حق حاصل ہونا چاہئے۔ کہ بیروزگاری کی صورت میں انہیں حکومت کی طرف سے مالی امداد دی جائے۔ اور بیماری، بڑھاپے، معذوری یا کسی اتفاقی حادثہ کی صورت میں جس سے جسمانی ناکارگی پیدا ہوا نہیں سرکار کی جانب سے گزارہ ملے۔ اسی طرح بیواؤں، یتیموں اور ایسے تمام افراد کو جو ناگزیر

اسباب کی بنا پر معاشی حیثیت سے اتنے کمزور ہوں کہ اپنی ضروریات کی کفالت نہ کر سکیں۔ حکومت کی مالی اعانت حاصل ہونی چاہیئے۔ اس مقصد کے لئے حکومت کو معاشرتی تحفظ کا ایک مکمل نظام قائم کرنا چاہیئے جس سے توخذ عن الاغنیاء وتردّ علی الفقراء کا اسلامی منشاء پورا ہو سکے۔ نظام تعلیم کے دائرہ میں عقیدۂ توحید کا علمی اقتضاء یہ ہے کہ ہم رُوح اور ذہن اور جسم کے متضاد تقاضوں کے مابین کامل ہم آہنگی پیدا کریں اور شخصیت کے ان تینوں پہلوؤں میں سے کسی ایک پر اتنا زور نہ دیں جس سے دوسرے پہلوؤں کی اہمیت عملاً نظر انداز ہو جائے۔

ہماری موجودہ تعلیم صرف ذہنی تربیت پر زور دیتی ہے۔ اس میں انسان کی روحانی تندرستی اور اخلاقی صحت کے تقاضوں کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا ہے۔ اسی طرح طلبہ جسمانی حالت کو درست کرنے پر بھی کم توجہ کی جاتی ہے۔ اس طرزِ تعلیم کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے طلبہ ذہنی حیثیت سے ترقی یافتہ ہونے کے باوجود اخلاقی حیثیت سے کم مایہ اور جسمانی حیثیت سے کمزور رہتے ہیں۔ موجودہ تعلیم نے ہماری نوجوان نسل کو مادّی منفعت کا پرستار بنا کر اس میں سے مقصد اور نصب العین کی حرارت بالکل فنا کر دی ہے۔ ہمارے تعلیم یافتہ اشخاص کی یہ حالت ہے کہ وہ کسی اجتماعی مقصد کے لئے زندگی بسر کرنے یا اُس کے حصول میں اپنی جسمانی اور ذہنی طاقتیں صرف کرنے کے خوگر نہیں رہے ہیں۔ انہیں تعلیم ختم کرنے کے بعد اس سے بحث نہیں رہتی ہے۔ کہ کون سا اجتماعی مقصد صحیح ہے اور کونسا غلط، وہ ہر اس مقصد کی خدمت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ جس سے فوری طور پر مادی نفع کی توقع ہو خواہ اخلاقی حیثیت سے وہ کتنا ہی ضرر رساں ہو۔

غرضیکہ جلب منفعت اور زر پرستی کی وبا نے ہماری تعلیم یافتہ سوسائٹی کو اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے۔ اس کے اخلاقی کردار میں کوئی فضیلت باقی نہیں رہی ہے۔ اور محض دولت کی طلب، شہرت کی خواہش یا جھوٹی عزت کی ہوس اس کے تمام اعمال کی محرک ہو گئی ہے۔ اس صورتِ حال کی ذمہ داری موجودہ نظامِ تعلیم پر ہے۔ جس میں زندگی کے ذہنی رُخ کو بیجا اور مبالغہ آمیز اہمیت دے دی گئی ہے۔ عقیدہ توحید کا فطری مطالبہ یہ ہے کہ انسانی شخصیت کا متوازن ارتقاء عمل میں آئے اور انفرادی زندگی میں جسمانی، ذہنی اور اخلاقی عناصر کو یکساں اہمیت دی جائے۔ اس لحاظ سے ہمیں تعلیم کے اخلاقی اور مذہبی پہلو پر زیادہ توجہ کرنی چاہیئے۔ تاکہ طالب علموں میں ذہنی وسعت اور علمی گہرائی کے ساتھ کردار کی خوبیاں اور اخلاق کی فضیلتیں بھی پیدا ہو سکیں۔ اسی کے ساتھ حفظانِ صحت کے اصولوں اور جسمانی حالت کی اصلاح کے مختلف طریقوں کو بھی ہماری تعلیم میں مناسب جگہ ملنی چاہیئے۔ محض ذہنی وسعت معلومات کی زیادتی یا فنی مہارت ہماری تعلیمی جدوجہد کا مقصود نہیں ہو سکتی ہے ہمیں ایسے تعلیم یافتہ افراد کی ضرورت نہیں ہے جو اپنی ذہنی قابلیت کا اشیائے تجارت کی طرح بھاؤ تاؤ کرتے پھریں۔ اور اپنے علم کو محض آمدنی اور نفع اندوزی کا ذریعہ قرار دیں۔ ذہنی وسعت اور قابلیت کے ساتھ ہماری نوجوان نسل کو مذہبی اور قومی خلوص کے صفات بھی پیدا کرنے چاہئیں اور ان میں یہ تمیز بھی ہونی چاہیئے۔ کہ کون سا مقصد عقیدہ توحید کے مطابق اور کون سا اس کے منافی ہے۔

قومیت اور بین الاقوامیت کی کشاکش میں اسلامی عقیدہ توحید ہمیں بین الاقوامیت کی طرف مائل کرتا ہے۔ اسلامی تعلیم کے

رُو سے یکطرفہ زندگی ناپسندیدہ ہے۔ جو شخص زندگی کے کسی ایک رُخ پر مائل ہو جائے۔ اور حُبِّ ذات، حُبِّ خاندان یا قوم کی اُلفت میں اتنا گرفتار ہو کہ اُسے وسیع تر انسانی اغراض کا کوئی پاس نہ رہے۔ وہ عقیدۂ توحید کے تقاضوں سے ناآشنا ہے۔ اس عقیدہ کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ آدمی وسیع تر انسانیت کی فلاح و بہبود کو ہمیشہ مدِّ نظر رکھے اور انسانی معاملات کو شخصی، خاندانی، قبائلی یا صوبائی مفاد کے نقطہ نظر سے دیکھنے کے بجائے کل انسانیت کے نقطہ نظر سے دیکھے۔ بلاشبہ اسلام نے نفس، خاندان، قبیلہ اور قوم کے حقوق بھی تسلیم کئے ہیں۔ اور ایسی زندگی بھی عقیدۂ توحید کے منافی ہے جس میں آدمی اپنے خاندان، صوبہ یا قوم کے جائز حقوق کی پرواہ نہ کرے۔ یا ان کے مفاد اور بہتری کے کاموں میں حصّہ نہ لے۔ لیکن اسلام ہم سے یہ مطالبہ ضرور کرتا ہے۔ ہم خاندانی یا صوبائی مفاد کے مقابلہ میں قوم کے مفاد اور قومی مفاد کے مقابلہ میں کل انسانیت کے مفاد کو ترجیح دیں اور محدود اغراض کی پرستش سے اپنا دامن بچائے رہیں۔

عقیدہ توحید کا یہ بھی تقاضا ہے کہ انسان اپنی زندگی کی سرگرمیوں کو کسی خاص شعبۂ حیات تک محدود نہ رکھے بلکہ جس شعبہ سے اس کا تعلق ہو اس کے علاوہ دوسرے امور میں بھی تھوڑی بہت دلچسپی لیتا رہے۔ تاکہ معاملاتِ زندگی کے متعلق اس کا نقطۂ نظر محدود نہ ہونے پائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جو جامعیت پائی جاتی ہے، اسلام اپنے پیروؤں سے اسی درجہ کی تو نہیں لیکن اسی طرز کی جامعیت کا مطالبہ کرتا ہے۔ جس طرح آپؐ پیغمبر اور معلمِ اخلاق ہونے کے ساتھ ایک اعلیٰ درجہ کے سیاست دان اور فوجی جنرل بھی تھے۔ جس طرح آپ عائلی زندگی میں ایک شفیق باپ اور محبوب شوہر ہونے کے علاوہ پبلک زندگی میں بھی اخلاق کے بلند ترین مقام پر فائز تھے۔ اسی طرح ہر مسلمان کو کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ اس طرح کی بہت سی خصوصیات کا جامع ہو اور اس کی زندگی یکطرفہ نہ رہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہ جامعیت قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا امتیازی وصف تھی۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ میں حکمرانی اور سیاست کی قابلیت کے ساتھ اخلاقی بلندی علمی بصیرت اور مجتہدانہ غور و فکر کی صفات بھی پائی جاتی تھیں۔ بنو اُمیہ کے دَور میں بھی بہت سے خلفاء مثلاً عبدالملک اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اسی جامعیت کے حامل تھے۔ عام مسلمانوں کی زندگی بھی اسی طرز کی شخصیتوں سے خالی نہ تھی۔ مسلمان بیک وقت مسجد کا امام بھی ہوتا تھا۔ فوجی خدمات بھی انجام دیتا تھا۔ شہری اور مدنی معاملات سے بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ اور علم و فضل کے ذوق سے بھی ناآشنا نہ تھا۔ جیسا جیسا زمانہ گذرتا گیا یہ جامعیت مسلمانوں کی زندگی سے مفقود ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک وقت وہ آیا جب صوفیاء کو تصوّف کے علاوہ محدثین کو حدیث کے علاوہ اور حکمرانوں کو سیاست کے علاوہ کسی اور شعبہ زندگی کا ذوق نہ رہا۔ یہی حالت آج تک قائم رہی۔ ہمارے سیاست دان علمی بصیرت سے بے بہرہ، اخلاقی تقاضوں سے ناآشنا اور سیرت و کردار کی عظمت سے عاری ہیں۔ ہمارے علماء اور فقہاء رموزِ سیاست سے بے خبر اور جدید تمدّنی میلانات و رجحانات سے ناواقف ہیں۔ ہمارے ماہرینِ معاشیات کو اپنے فن کے سوا اور علوم و فنون کا کوئی ذوق نہیں ہے۔ ہمارے تاجروں کو منڈیوں کے حالات اور قیمتوں کے اُتار چڑھاؤ کے علاوہ تمدّنی اور علمی مشاغل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہمارے صحافیوں اور ایڈیٹروں کو وقتی سیاست کے علاوہ زندگی کے دوسرے شعبوں کا کوئی علم نہیں۔ اسلام

خالص سیاست دانوں، خالص علماء، خالص ماہرین، خالص صحافیوں اور خالص تاجروں کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ایسے اشخاص پیدا کرنا چاہتا ہے جو زندگی کا اُس کی تمام وسعتوں کے ساتھ مشاہدہ کر سکیں۔ اور جو اپنے مخصوص پیشوں یا علوم اور فنون میں غیر معمولی انہماک کے باعث یک رُخے نہ ہوں۔ وہ سیاسی بصیرت کے ساتھ اخلاقی عظمت، علمی تبحّر کے ساتھ، عملی قوت حکمرانی کی قابلیت کے ساتھ مجاہدانہ صلاحیت جمع کرنا چاہتا ہے۔ وہ قوم وملّت کی رہنمائی کا کام ایسے اشخاص کے سپرد کرنا چاہتا ہے جو کسی جزو کو کل نہ سمجھ بیٹھیں۔ اور مسائلِ حیات کو ایک آنکھ سے دیکھنے کے عادی نہ ہوں۔ بلکہ وسیع النظر اور جامع علم وعمل ہوں۔ ہماری موجودہ زندگی کی خرابیوں کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہم میں اس جامعیت کے انسانوں کی کمی بلکہ فقدان ہے۔

علم وفن میں اختصاصی میلانات اتنے غالب آگئے ہیں۔ اور تعلیم یافتہ اشخاص کو اپنے مخصوص شعبہ یا پیشہ کے مسائل کے سوا اخلاقی، مذہبی اور تمدنی امور سے اتنی کم دلچسپی رہ گئی ہے کہ اُن کے لئے زندگی کی وحدت کا تصور خواب وخیال ہو گیا ہے اور انہیں یہ قابلیت باقی نہیں رہی ہے کہ وہ بصورت کل اس کا ادراک کر سکیں۔ یہ یک رُخاپن اور یکطرفہ نقطۂ نظر اس جامعیت کے بالکل منافی ہے۔ جو عقیدہ توحید کے لازمی نتیجہ کے طور پر وجود میں آنی چاہئے۔ اور جس کا اعلیٰ ترین نمونہ خود رسول اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی تھی۔ اگر مسلمان حضور رسالتمآب کی زندگی کو اپنے لئے اُسوۂ حسنہ سمجھتے ہیں تو انہیں اپنے اندر اسی طرز کی جامعیت پیدا کرنی چاہئے۔ یہ کام بھی ہمارے نظامِ تعلیم کی اصلاح ہی سے انجام پا سکتا ہے۔ ہمارا تعلیمی نظام ایسا ہونا چاہئے جس میں طلباء کو زندگی کے ہر پہلو اور ہر تقاضے سے آشنا کیا جائے اور علوم وفنون میں سے انہیں ہر ضروری علم کی ابتدائی تعلیم دی جائے۔ اختصاصی تعلیم بے شک ضروری ہے لیکن اس کی منزل بعد میں آتی ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اپنے طالب علموں کو کسی علم یا فن کی خصوصی مہارت کے لئے تیار کریں، ہمارا یہ فرض ہونا چاہئے کہ ان میں جسمانی، اخلاقی اور ذہنی حیثیت سے جامعیت کے اوصاف اور مذہبیات، اخلاقیات، تاریخ، مدنیات اور علم حفظانِ صحت کے بنیادی حقائق کی واقفیت پیدا کریں۔ جب تک ہمارے نظامِ تعلیم وتربیت میں اس جامعیت کو بطور مقصد پیش نظر نہ رکھا جائے گا۔ ہماری نوجوان نسل میں موجودہ یک رُخاپن اور وسیع النظری کا فقدان برابر جاری رہے گا۔ اور ان کی شخصیتیں اس توازن اور اعتدال وتوسّط سے محروم رہیں گی۔ جس کی تخلیق کے لئے اسلام نے اپنا توحیدی تصورِ کائنات آراستہ کیا تھا۔

مقامِ انسانیت

مصنفہ محمد مظہر الدین صدیقی ایم۔ اے

قیمت ایک روپیہ

اسلام کا نظریۂ تاریخ

مصنفہ محمد مظہر الدین صدیقی ایم۔ اے

قیمت تین روپے

پتہ:۔ سکرٹری ادارہ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور